ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

تصنیف

رسا چغتائی

ساقی ارباب ذوق

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات :

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

تصنیف

انور معظم کے لیے

رسا چغتائی

رسا چغتائی

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

کتابت : عزیز احمد، غلام محی الدین

قیمت : ۱۵ روپے

اشاعت : اول ۱۹۸۶ء

تعداد : ایک ہزار

پرنٹر :

پبلشر : رسا پبلیکیشنز
مشرقی آئی ۹۰، کورنگی نمبر ۵ کراچی

تصحیح: صفحہ ۲۵ پر پہلا مصرعہ اس طرح ہے :- شاید دھرتی پر

ساتھی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

رسا چغتائی کی شاعری میں چاند ایک ممتاز سفارتکار ہونے کے علاوہ ایک خوبصورت شاعر بھی ہے۔ اس کی شاعری سیاروں کی سفیر ہے اور یہ سیارے اس کے لفظوں کی گرفت سے باہر نہیں ہیں لوگ بے سبب نہیں کہتے کہ شاعری کے پردے میں سچائی اپنا اصل وجود تلاش کر لیتی ہے اور یوں تاریخی بھی بن جاتی ہے اور بہت کچھ۔

یہ کون نہیں جانتا کہ سمندر اپنے جلال سے اور ماہی گیر اپنی بوٹ (BOAT) سے نہ سہی اپنے جال سے ضرور پہچانا جاتا ہے۔ لیکن یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ہم ماہی گیر کے جال میں ہیں۔ اور ماہی گیر ایک سنہرے جال میں۔ وحدتِ وجود کی طرف اس سے زیادہ خوبصورت اشارہ بہت کم ممکن ہے لیکن یہ درویش ایسا صوفی ہے جس کے قلب پر اس عہد کی آگہی بھی ٹیڑھی ترچھی لکیروں میں سہی پڑ ضرور رہی ہے وہ کہتا ہے میرا کوئی حریف نہیں ہے میں اپنے آپ سے جنگ کر رہا ہوں۔ یہی نہیں ایک دہشتناک بات وہ یہ بھی کہتا ہے کہ یہ کیسی روشنی ہے جو میرے اور خدا کے درمیان حائل ہے۔ یہ روشنی اِس عہد کی آگہی کے سوا اور کیا ہے۔ ہمارے عہد کے شعور پر اس سے بہتر شعر کم کہا گیا ہے۔

اِس گھر کی ساری دیواریں شیشے کی ہیں
لیکن اِس گھر کا مالک خود اِک پتھر ہے

رسا چغتائی سے ملیے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے آپ کسی درویش سے مل رہے ہیں ایسے درویش سے جسے فقر کے سوا اپنے عہد کے وجدان نے بھی عجیب تر بنا دیا ہے وہ اب بھی روایتوں سے لپٹا ہوا ہے۔ اُس سے باتیں کیجیے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ایک مجذوب ہے تھکا ہارا اور منفرد۔ مگر اس مجذوب پر خدا نے جدیدیت کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ قدیم تو بس خدا کی ذات ہے اور جدیدیت رسا چغتائی اور ہمارے عہد کی تقدیر۔

یونان کے دیوی، دیوتاؤں کی سب سے بڑی خداوند یعنی سب سے بڑی حکمراں یہی تقدیر تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ تقدیر کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں یعنی کسی چیز کے لئے ایک خاص طرح کی حالت ٹھہرا دینے کے، خواہ یہ ٹھہراؤ کمیت کا ہو یا کیفیت کا یعنی فطرت نے ہر وجود کی جسمانی ساخت اور معنوی حیثیت کے لئے ایک خاص طرح کا اندازہ ٹھہرا دیا ہے جس سے وہ باہر نہیں جا سکتا۔ یہ اندازہ ایسا ہے جو اُس سے مکمل مناسبت رکھتا ہے، خُدا نے ہر چیز کے لئے اس کی حالت اور ضرورت کے مطابق ایک مخصوص اندازہ ٹھہرا دیا ہے۔

اِک لڑی میں پرو دیے کس نے
آدمی، دشت، پھول، سیارے
چاند ہوتا نہیں ہر اِک چہرا
پھول ہوتے نہیں سخن سارے
چھت کے اوپر سونے والے
سورج سر پر آسکتا ہے
گھر کا رستہ بھولنے والا
چوراہے پر آسکتا ہے
خواب میں آنے والا اِک دِن
خواب سے باہر آسکتا ہے

تقدیر کا احساس رسا چغتائی کے ایسے سارے اشعار کو جنم دیتا ہے زندہ رکھتا ہے اور ہم تک پہونچاتا ہے۔ تقدیر کا یہ احساس دوسروں کے یہاں المناک ہے لیکن رسا کے یہاں ٹریجک نہیں حیرت ناک ہے، اس کے ہاں تقدیر ایک عالمِ امکان بھی ہے۔

رسا چغتائی کی شاعری کا وہ جوہر جو اِس تصنیف میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ وہ انسان اور اس کی کائنات کی تقدیر کا انکشاف ہے۔ مگر یہ انکشاف شاعری کی زبان میں ہُوا ہے۔ یہی تقدیر کا انکشاف رسا کی شاعری کا اصل جوہر ہے۔ لیکن بیسویں صدی کی تقدیر بھی عجیب ہے۔

یہ میری آنکھوں کے نیلم ہیں
ان میں ایک شام کا اور
ایک صبح کا ستارہ ہے

قمر جمیل

کیا گماں کیا خبر
اک دھواں سا مگر
اِس فضا میں کہاں
طائرانِ شجر
کیا بساطِ ہوا
کیا چراغِ ہنر
آسماں سرنگوں
پائے طاؤس پر
اک عجب بوجھ سا
میرے اعصاب پر

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

کیا بنا رکھیے

اب سرِ رہگزر
راہ دکھلا گئیں
بجلیاں کوند کر
آئینہ رکھ گئی

رات دیوار پر

کھڑکیاں کھولیے
آسماں دیکھ کر
خاک میں مل گئی
سب متاعِ ہنر

قمریاں کو بہ کو

راستے در بدر

اب کہاں ڈھونڈیے

روشنی کا شجر

مرجعِ خلق ہے

ایک تاریک گھر

قرضِ درویش کیا

ایک درویش پر

سناٹا بام و در سے

برسے ہے اک پہر سے

کیا سیلِ باد و باراں

گزرے ہے آگ پر سے

اس سایہ بارِ گل کو

نسبت ہے کس شجر سے

کھینچے ہے تیغِ ابرو

گزرے ہے جب ادھر سے

وحشت کرے ہے کیا کیا

مژگانِ رہ گزر سے

بالوں کو اپنے ظالم
باندھے ہے کس ہنر سے
ٹوٹا ہے آج کیسا
آئینہ شیشہ گر سے
ظالم کہا میں اُس کو
خلقِ خدا کے شر سے
تجھ لب سنی میں خوبی
گلہائے تازہ تر سے

موسم کیسا گیانی ہے
پتھر پانی پانی ہے

لہریں کیسی منگتی ہیں
ساحل کیسا دانی ہے

اس بستی کی سچائی
اس بستی کا پانی ہے

جاتے جاتے جائیگی
برسوں کی ویرانی ہے

ہم بھی ہیں اک آوارہ
رات بھی اک دیوانی ہے

کچھ تو رستے ایسے ہیں
کچھ میری بے دھیانی ہے

آجاتی ہے سولی پر
نیند بڑی مستانی ہے

اس خطے میں ہم بھی ہیں
یہ خطہ بارانی ہے

جو کچھ ہے یاں مایا ہے

مایا آنی جانی ہے

اُس کے سات سمندر ہیں

میری ایک کہانی ہے

آپ رَسا سے واقف ہیں

میرا یارِ جانی ہے

ہاتھ میں خنجر آسکتا ہے

یا پھر ساغر آسکتا ہے

آنکھیں زخمی ہو سکتی ہیں

ذرّہ اُڑ کر آسکتا ہے

چھت کے اوپر سونے والے

سورج سر پر آسکتا ہے

خواب میں آنے والا اک دن

خواب سے باہر آسکتا ہے

کالا جادو کرنے والا

مشعل لے کر آسکتا ہے

سارے منظر چھپ سکتے ہیں

ایسا منظر آ سکتا ہے

شاید کوئی آنے والا

لمحہ بہتر آ سکتا ہے

گھر کا رستہ بھولنے والا

چوراہے پر آ سکتا ہے

مٹی ہجرت کر سکتی ہے

دریا چل کر آ سکتا ہے

رات ہم نے جہاں بسر کی ہے
یہ کہانی اُسی شجر کی ہے

یہ ستارے یہاں کہاں سے آئے
یہ تو دہلیز میرے گھر کی ہے

نیند کیا کیجئے کہ آنکھوں میں
اک نئی جنگ خیر و شر کی ہے

میرے کچّے مکان کے اندر
آج تقریب چشمِ تر کی ہے

ہجر کی شب گزر ہی جائے گی
یہ اُداسی تو عمر بھر کی ہے

عشق اپنی جگہ مگر ہم نے
منتخب اور ہی ڈگر کی ہے

اٹھ رہا ہے دھواں مرے گھر میں
آگ دیوار سے اُدھر کی ہے

ہم نے اپنے وجود کی چادر
تنگ اپنے گمان پر کی ہے

وہ ستارہ شناس ایسا تھا
یا کسی نے اُسے خبر کی ہے

جا رہے ہو کدھر رسا مرزا
دیکھتے ہو ہوا کدھر کی ہے

سامنے جی سنبھال کر رکھنا
پھر وہی اپنا حال کر رکھنا

آ گئے ہو تو اس خرابے میں
اب قدم دیکھ بھال کر رکھنا

شام ہی سے برس رہی ہے رات
رنگ اپنے سنبھال کر رکھنا

عشق کارِ پیمبرانہ ہے
جس کو چھونا مثال کر رکھنا

کشت کرنا محبتیں اور پھر
خود اُسے پائمال کر رکھنا

روز جانا اداس گلیوں میں
روز خود کو نڈھال کر رکھنا

سخت مشکل ہے آئینوں سے رسا
واہموں کو نکال کر رکھنا

نام جو بھی ہو نسب جو بھی ہو
تھا وہ اک شخص عجب جو بھی ہو

اس سے کہنا کہ کبھی آ کے ملے
ہم سے رنجش کا سبب جو بھی ہو

چاند نکلا ہے سرِ شاخِ گلاب
یا پسِ خیمۂ شب جو بھی ہو

مجھ میں جو شخص چھُپا بیٹھا ہے
مجھ سے کہتا ہے کہ اب جو بھی ہو

رقص جاری رہے تاروں سے کہو
معرکہ آخرِ شب جو بھی ہو

مسئلہ میرا رفاقت ہے رسّا
مذہبِ بنتِ عنب جو بھی ہو

کہاں جاتے ہیں آگے شہرِ جاں سے
یہ بل کھاتے ہوئے رستے یہاں سے

وہاں اب خواب گاہیں بن گئی ھیں
اُٹھے تھے آبدیدہ ہم جہاں سے

زمیں اپنی کہانی کہہ رہی ہے
الگ اندیشۂ سود و زیاں سے

اِنہیں بنتے بگڑتے دائروں میں
وہ چہرہ کھو گیا ہے درمیاں سے

اٹھالایا ہوں سارے خواب اپنے
تری یادوں کے بوسیدہ مکاں سے

میں اپنے گھر کی چھت پر سو رہا ہوں
کہ باتیں کر رہا ہوں آسماں سے

وہ ان آنکھوں کی محرابوں میں ہر شب
ستارے ٹانک جاتا ہے کہاں سے

رسا اس آبنائے روز و شب میں
دمکتے ہیں کنول فانوسِ جاں سے

عمر گزری رہ گزر کے آس پاس
رقص کرتے اُس نظر کے آس پاس

زلف کھلتی ہے تو اٹھتا ہے دھواں
آبشارِ چشمِ تر کے آس پاس

کوندتی ہیں بجلیاں برسات میں
طائرِ بے بال و پر کے آس پاس

رات بھر آوارہ پتّے اور ہوا
رقص کرتے ہیں شجر کے آس پاس

چھوڑ آیا ہوں متاعِ جاں کہیں
غالباً اُس رہ گزر کے آس پاس

بال بکھرائے یہ بوڑھی چاندنی
ڈھونڈتی ہے کیا کھنڈر کے آس پاس

اُس گلی میں ایک لڑکا آج بھی
گھومتا رہتا ہے گھر کے آس پاس

ایک صورت آشنا سائے کی دھوپ
پڑ رہی ہے بام و دَر کے آس پاس

کیسے پُراسرار چہرے ہیں رسا
خواب گاہِ شیشہ گر کے آس پاس

اب جو دیکھا تو داستان سے دور
اٹھ رہا تھا دھواں چٹان سے دور

دیکھنا کیا مکان کی جانب
اب یہاں بیٹھ کر مکان سے دور

ہجر کس آنکھ کا ستارہ ہے
رقص کرتا ہے آسمان سے دور

زندگی کا کوئی ہدف تو بنا
دل کوئی صید کر کمان سے دور

جانتا ہوں زمین کِس کی ہے
بیٹھ جاتا ہوں سائبان سے دور

دل وہ آتشکدہ کہ روشن ہے
شہرِ شیراز و شیروان سے دور

لڑ رہا ہوں رسا قبیلہ وار
میرو مرزا کے خاندان سے دور

تیر جیسے کمان کے آگے
موت کڑیل جوان کے آگے

بادشاہ اور فقیر دونوں تھے
شہر میں اک دکان کے آگے

چلتے چلتے زمین رک سی گئی
ناگہاں اک مکان کے آگے

ہم بھی اپنا مجسمہ رکھ آئے
رات اندھی چٹان کے آگے

طشتِ جاں میں سجا کے رکھنا تھا
حرفِ دل مہمان کے آگے

کیا عجب شخص ہے کہ بیٹھا ہے
دھوپ میں سائبان کے آگے

ہم کسی کو گواہ کیا کرتے
اِس کھلے آسمان کے آگے

کب تلک جھوٹ بولتے صاحب
اس طرح خاندان کے آگے

کون کہتا رسا خدا لگتی
ایسے کافر گمان کے آگے

کل اُس کی آنکھوں میں تاروں کی ایک لڑی تھی
آج اُس کی آنکھوں میں دور تلک پس منظر ہے

اِس گھر کی ساری دیواریں شیشے کی ھیں
لیکن اِس گھر کا مالک خود اک پتھر ہے

رات کے اندھے کنویں میں یہ کس کی آنکھیں ہیں
دن کے کشکول میں یہ کس کا کاسۂ سر ہے

مٹی کا ایک گھروندا بناؤ اور پھر دیکھو
یہ سینہ کشادہ آسماں کتنا تنگ نظر ہے

یہ شہرِ بے اماں سے

یہ لوگ رائگاں سے

یہ شورِ مضمحل سا

یہ پیرِ نیم جاں سے

یہ عمرِ مختصر کے

انداز بے کراں سے

ہیبت زدہ سمندر

خاموش بادباں سے

جمہور دل گرفتہ

انسان بے زباں سے

امواج پا بہ جولاں
ساحل رواں دواں سے

تقدیر روشنی کی
وابستہ خاکداں سے

ہر شام اک ستارہ
نکلے ہے آسماں سے

ہر شام اک جہنم
گزرے ہے درمیاں سے

آیا رسا غزل میں
آتشکدہ کہاں سے

شہر کی ان سڑکوں پر مقتل سایا کرتے ہیں
یا پھر ہم سے خبطی پاگل سایا کرتے ہیں

ہجرت کرنے والا سورج گھر گھر جاتا ہے
گھر سے اٹھنے والے بادل سایا کرتے ہیں

مرزا پیارے ان رستوں پر کیونکر چلتے ہو
انگاروں پر کس کے آنچل سایا کرتے ہیں

کس طرف کوچ کر گئے سارے
کیا ہوئے روشنی کے مینارے

کون ایسا خدا کا دشمن ہے
سر پہ منڈلا رہے ہیں طیارے

ظلم کی چل رہی ہے پن چکّی
عدل کے بج رہے ہیں نقارے

سوکھنے کے قریب ہے دریا
ڈوبنے کے قریب ہیں تارے

اک لڑی میں پرو دیئے کس نے
آدمی، دشت، پھول، سیارے

جانے کن جنگلوں سے در آئے
شہرِ تنقید میں لکڑ ہارے

چاند ہوتا نہیں ہر اک چہرہ
پھول ہوتے نہیں سخن سارے

کس جہنم کا رزق ہوں مرزا
کس لئے چن رہا ہوں انگارے

اے خداوندِ ذوالجلال مجھے
ہو چلا ہے جنوں، سنبھال مجھے

رات لگتی ہے خواب دریا کا
نیند سرگوشیوں کا جال مجھے

رات اک شخص آئینہ تمثال
دے گیا اپنے خدوخال مجھے

وہ ستارہ نژاد سونپ گیا
کس خرابے کی دیکھ بھال مجھے

اب کسی خواب کے دریچے سے
دیکھ اے گردِ ماہ و سال مجھے

موسموں کا مطالبہ کیا ہے
کیوں بنایا ہے یرغمال مجھے

وہ ابھی خواب تھا کہ آنکھوں نے
دیکھنا کر دیا محال مجھے

ایک ایسی ہی شام تھی وہ بھی
یاد ہے طائرِ خیال مجھے

پہلے اُس نے رسّا چراغ دیا
اور پھر منصبِ وصال مجھے

رات ہے یا ہوا مکانوں میں
جل رہا ہے دیا مکانوں میں

جانے کیا ہو گیا مکینوں کو
جانے کیا ہو گیا مکانوں میں

لوگ کن واہموں میں رہتے ہیں
کاٹتے ہیں سزا مکانوں میں

اِک ستارہ زمین پر اترا
اور پھر کھو گیا مکانوں میں

ایسا لگتا ہے خواب کی تعبیر
دیکھتا ہے خدا مکانوں میں

ایک سائے سے روز ہوتا ہے
آمنا سامنا مکانوں میں

ان ستاروں کا مشغلہ ہے رسا
تاکنا جھانکنا مکانوں میں

کوئی تعمیر کی صورت نکالو
کوئی تازہ بنائے عشق ڈالو
بُلاتی ہیں تمہیں یادیں پرانی
چراغِ رفتگاں فرصت نکالو
مجھے چہروں سے خوف آنے لگا ہے
مرے کمرے سے تصویریں ہٹالو
یہ دریا ہے گزر جانا ہے اِس کو
مسافر ہو تم اپنا راستہ لو
کہاں اب وہ لباسِ وضعداری
بہت جانو اگر غربت چھپالو

وفا قیمت نہیں جو لوٹ آئے
تم اپنا از سرِ نو جائزہ لو
نہیں آزارِ جاں کوئی تو مرزا
کسی دیوار کا سایہ اٹھا لو

ہائیکو

شاید اس زمین پر
اُگنے والی پہلی بیل
عشقِ پیچاں تھی

دریا بجھا ہوا ہے
یا دل کے آئینے میں
پتھر رکھا ہوا ہے

کیا میں اور کیا تو
مٹی کی پُراسراریت
مٹی کی خوشبو

وہ دن بھی کیا تھا
جب سرِ شام ایک دریا سا
دل میں اتر رہا تھا

پرواز ہے سبو میں
رکھتے ہیں ہم بھی لیکن
اک آسماں لہو میں

پیپل جیسی چھاؤں
بستی بستی ڈھونڈ رہا ہوں
اپنا جیسا گاؤں

پُروائی کے نام
خط میں کس نے لکھا ہے
تنہائی اور شام

داستان گو

پھر یہ ہوا کہ میں
برگد کے درخت میں تبدیل ہو گیا

ناآفریدہ

میں آوازوں میں بٹ گیا ہوں

ہو سکتا ہے

ہر آنے والی آواز

میری ہی آواز ہو

کٹیلاگ

خدائے ذوالجلال
آنکھیں بند کئے دیکھ رہا ہے

آئینہ

یہ کیسی روشنی ہے
جو میرے اور خدا کے درمیان حائل ہے

کتبہ

پرانی قبر پر
نیا کتبہ نصب نہیں کیا جا سکتا

ایک قبر کے پاس

زلزلے آسکتے ہیں

لیکن

دل دھڑکنے کی آواز نہیں آسکتی

ساقی ارباب ذوق

قلعے کے اندر

دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہوں
تو مجھے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں
قید خانے کی سلاخیں معلوم ہوتی ہیں

0305 8406067
PDF Book Company

پس منظر

ہم سوداگر ہیں
ہمیں یہاں قید کر دیا گیا ہے
اور سامنے جھیل میں جو عکس ہے
وہ اس قید خانے کی کنجی ہے

دعا

اب اگر میرے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں
تو انہیں دعا کے لئے اٹھا لینا

اندھا

لیکن میرا مستقبل مجھ پر روشن ہے

موم بتی اور میں

میں اس کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتا
کہ سامنے دور تک اندھیرا ہے

ایک خط سے اقتباس

تم نے دیکھا
کہ یہ سیّارے
ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچنے کے خبط میں
آج تک معلّق ہیں۔

کھڑکیاں اور ستارے

آسمان یہ بات کیوں نہیں سمجھتا

کہ ہم

ایک وقت میں اتنے محاذ نہیں کھول سکتے

سنہرے خواب

وہ ہمارا بچپن تھا
جب ہم آسمان پر مٹی اچھالا کرتے تھے
یہ ہمارا لڑکپن ہے
جب ہم اس گملے میں مٹی بچھا رہے ہیں
ہو سکتا ہے
کل اس گملے میں سرخ گلاب ہوں
اور ہماری آنکھوں میں
سنہرے خواب

قزّاق

یہ ٹوٹی ہوئی کشتیوں کے تختے اور بادبان ہیں
لیکن ان ستاروں کے لئے
جو سرِ شام دریا میں ڈوب جاتے ہیں۔

ماہی گیر

سمندر اپنے جلال سے
اور ماہی گیر اپنے جال سے
پہچانا جاتا ہے۔

سرِشام

اتنا ضرور ہے

کہ ہم

ہر روز سورج کی روشنی میں

ایک تاریک گھر سے

دوسرے تاریک گھر تک پہنچ جاتے ہیں

جالے سے باہر

سمندر کی لہریں چٹان سے ٹکراتی ہیں

اور لوٹ جاتی ہیں

مکڑی اپنے اطراف جال بُنتی ہے

اور خود قید ہو جاتی ہے

نیلم

یہ میری آنکھوں کے نیلم ہیں
ان میں ایک شام کا اور
ایک صبح کا ستارہ ہے

چور

تم کون ہو

میں سپاہی ہوں

یہاں تاریکی میں کیا کر رہے ہو

اگلے مورچے کے لئے خندق کھود رہا ہوں

زینہ

باپ بچے کو چھت پر
اور بچہ آسمان پر
چاند کو دیکھ رہا ہے

ہیڈ مسٹریس

میں بچّوں کے سامنے زندگی کا آموختہ دہراتی ہوں

بچّے

مجھے علم بھی دیتے ہیں اور روٹی بھی

اِنتظار

ہمارے پاس

اپنے باپ کی محنت میں ہاتھ بٹانے کا اک یہی طریقہ ہے

کہ ہم

اس روٹی کو آپس میں بانٹ لیں

معبدوں کے چراغ

معبدوں میں چراغ جلانے والے آگئے ہیں
اس سے پہلے کہ یہ رات جہنم میں تبدیل ہو
ہم اپنے اندر سے بیج برآمد کرلیں

آخری چراغ

اس بستی کے سارے چراغ ایک جیسے ہیں
تم اپنے دل کا آتش کدہ بجھنے نہ دینا
کہ یہ اس مقدّس مٹی کا آخری چراغ ہے

تمثیل

شاید ہم کسی دریا کا خواب ہیں

اور ہمارے خواب

کسی نادیدہ دریا کے وجود کی تمثیل

رات

کیا یہ بات ہمارے لئے فخر کی نہیں
کہ چاند
ممتاز سفارت کار ہونے کے علاوہ
ایک خوبصورت شاعر بھی ہے

ماہی گیر

ماہی گیروں کو یقین ہے
کہ سورج کی سنہری انگوٹھی کو
کسی سمندری مچھلی نے نگل لیا ہے

مچھلیاں

ہم ماہی گیر کے جال میں ہیں
اور ماہی گیر
ایک سنہرے جال میں

سمندر

میرا کوئی حریف نہیں ہے
میں اپنے آپ سے جنگ کر رہا ہوں

میت کی آواز

میں گھر کی ایسی چوکھٹ ہوں
جسے دیمک کھا گئی ہے
میں اب کسی کا خیر مقدم نہیں کر سکتی

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

یہ ذرّوں کی طرح بکھرے ہوئے لوگ
یہ گم صُم پتھروں کے سائباں سے

تصنیف

قیمت ۱۵ روپے

کلام : رسا چغتائی